نوادرات

(ہمارے ایک ——— ذی علم، صاحب فکر، قرآنی دوست، انگلستان میں مقیم ہیں ——— انہوں نے پرویز صاحب سے چند ایک اہم نکات کی وضاحت چاہی تھی جسے انہوں نے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط، مکتوب نگار اور مکتوب علیہ تک ہی محدود تھا لیکن ہم نے جب اس کے مندرجات پر نگاہ ڈالی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسے، انہی دو تک محدود رکھنا بخیلی ہوگا، رزاقی نہیں۔ اس کی اشاعت عام ہونی چاہیئے۔ بنابریں، اسے، دو ایک (ذاتی نوعیت کے) فقرات حذف کرکے، اور پرویز صاحب کی اجازت سے، حوالۂ طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد قارئین ہم سے متفق ہوں گے کہ ہمارا یہ فیصلہ کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جانا چاہیئے ——— نامناسب نہیں تھا۔)

اب وہ خط ملاحظہ فرمایئے۔ (طلوعِ اسلام)

——— (٥) ———

محترمی السلام علیکم!

علامہ اقبال رحمہ سے متعلق اُلجھنوں کو تو "تصوّف کی حقیقت" نے دُور کر دیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اصل یہ ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں وحی کی ضرورت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انسان کتنا ہی بڑا دانشور، مصلح، مفکر کیوں نہ ہو، اس کا خود اپنے داخلی یا خارجی مؤثرات سے متاثر ہو جانا امکانات میں سے ہے۔ یہ صرف وحیٔ خداوندی ہے جو کسی مؤثر سے متاثر نہیں ہوتی۔ خالص (OBJECTIVITY) صرف وحی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو اور نو اندا اس نے خود نبیؐ سے بھی اپنی وحی پر ایمان لانے کے لئے کہا ہے۔ ایمان لانے کے معنی ہوتے ہیں وحی کو ہر معاملہ میں قولِ فیصل سمجھنا۔ نبیؐ کا بھی اپنی بشری حیثیت میں مؤثرات سے متاثر ہو جانے کا امکان تھا۔ اس لئے اسے بھی وحی سے فیصلہ لینے کے لئے کہا۔ جب وہ تبلیغ وحی کرتا تھا تو اس میں (SUBJECTIVITY) کا قطعاً دخل نہیں ہوتا تھا۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ لیکن جب وہ کچھ اپنی طرف سے کہتا تو اس میں مختلف مؤثرات کے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اثر انداز ہو جانے کا امکان ہوتا تھا۔ خدا نے جب مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا ہے (۴/۱۳۶) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جملہ امور میں قولِ فیصل وحی کو قرار دیں، نہ کہ کسی

شخصیت کو ان کے لئے راہ صواب یہی ہے کہ وہ بڑی سی بڑی شخصیت کے افکار و اقوال کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں۔ جو اس کے مطابق ہو اُسے قابلِ قبول سمجھیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیں۔ اس استرداد سے اس شخصیت کی سُبکی نہیں ہو جاتی۔ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ ہم اسے صاحبِ وحی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ (یا اُن کے معتقدین میں سے کوئی) اسے بُرا مناتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو (یا معتقدین انہیں) صاحبِ وحی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ اپنی زندگی کے اوّلین سانس سے لے کر آخری سانس تک، ہر حال میں نبیؐ تھے۔ یعنی آپ کا ہر قول و عمل مبنی بر وحی ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ اُن کے ہاں اس قسم کی روایات بھی ہیں کہ (مثلاً) حضورؐ ایک دفعہ ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپؐ نے دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا اس نماز کی چار رکعتوں کی بجائے دو رکعتیں رہ گئی ہیں؟ پہلے تو آپؐ نے پوچھا کہ کیا میں نے دو رکعتیں پڑھی ہیں؟ اور جب اس کی توثیق ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ میرا سہو تھا۔ نماز دوبارہ پڑھی جائے گی۔ یہ تو صحابہ رضؓ کی روشن ضمیری تھی کہ وہ حضورؐ کی نبوی اور بشری زندگی میں فرق ملحوظ رکھتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اس واقعہ پر خاموش رہتے تو حضورؐ کا وہ سہو آنے والوں کے لئے، دین بن جاتا! صحابہؓ کبار کی تو یہ کیفیت تھی اور ہماری شخصیت پرستی کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ذرا سا بھی واجب الاحترام ہو، اُس کی کسی بات پر تنقید کرنا، کفر اور الحاد قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارا (مروّجہ) اسلام شخصیتوں کے افکار و اعمال کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ دینِ خداوندی کا اس میں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک کسی کا احترام و تکریم اسی حد تک ہونا چاہیئے جس حد تک اس کی فکر، قرآنی حقائق سے ہم آہنگ، اور اُس کا کردار قرآنی معیار کے مطابق ہو۔ میں نے "تصوّف کی حقیقت" میں اسی اصول کو مدّ نظر رکھا ہے۔

۳۔ اب آئیے اپنے دوسرے نکتہ کی طرف۔ یعنی قرآن کے معاشی نظام میں ذاتی ملکیت اور عبوری دَور سے متعلق احکام کی حیثیت۔ سب سے پہلے عبوری دَور سے متعلق احکام کو لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے بالغ نظر، صاحبِ فکر و دانش کے لئے یہ سمجھنا قطعاً دشوار نہیں ہوگا کہ قرآن اپنے نظام کو محض احکام و قوانین کے ذریعے، میکانکی طور پر قائم نہیں کرتا۔ بنابریں عبوری احکام کے یہ معنی نہیں کہ وہ منتہی احکام کی تدریجی شکل ہیں اور بس۔ قرآن کا اصل مقصود، انسانیت سازی ہے۔ اور وہ جس قدر نظام ہائے حیات قائم کرتا ہے۔ (معاشرتی۔ سیاسی۔ معاشی۔ عمرانی وغیرہ) وہ مقصود بالذات نہیں۔ یعنی اس سے کا مُنا تی فضا یا انسانی دنیا کو یہ دکھانا مقصود نہیں کہ خدا کے نظام کس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں۔ یہ تمام نظام درحقیقت، انسانیت سازی (یا غالب کے الفاظ میں آدمی کو انسان بنانے) کے ذرائع ہیں۔ اقبالؒ نے قرآن کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر آپ ذرا غور کیجئے کہ جن افراد کو سطحِ آدمیت سے اٹھا کر مقامِ انسانیت تک پہنچانا مقصود تھا، جب اس پروگرام کی ابتدا کی گئی تھی تو اُن کی تمدنی اور معاشرتی سطح کیا تھی؟ خود قرآن کی شہادت کی رُو سے انہیں یہ بھی بتانا، سکھانا اور سمجھانا پڑتا تھا کہ

(۱) جب کسی کے ہاں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو دروازے کے باہر سے آواز دینی چاہیئے۔

(۲) کسی کے ہاں جانا ہو تو پہلے اس سے اجازت لینی چاہیئے۔

(۳) اگر کوئی کھانے کے لئے بلائے تو ایسا نہ کرو کہ ابھی اس کے ہاں ہانڈیاں چولھے پر رکھی ہوں، اور تم وہاں براجمان ہو جاؤ۔

(۴) محفل میں بیٹھو تو اس طرح کہ جب کوئی اور آجائے تو اس کے لئے جگہ نکال دو۔

(۵) چیخ چیخ کر نہ بولا کرو۔

(۶) اکڑ اکڑ کر نہ چلا کرو۔

(۷) آپس میں بے ہودہ تمسخر نہ کیا کرو۔

(۸) ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام نہ رکھا کرو۔

(۹) خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔

(۱۰) کسی کی غیبت نہ کیا کرو۔

(۱۱) دوسروں سے متعلق حسنِ ظن سے کام لیا کرو۔

(۱۲) یونہی، بلا تحقیق افواہیں نہ پھیلایا کرو۔

(۱۳) نہ ہی سرگوشیاں کیا کرو۔

یہ تھی ان لوگوں کی معاشرتی سطح۔ حضری آبادیاں قدرے گوارا تھیں، لیکن ایک تو وہ بہت قلیل تھیں اور دوسری طرف وہ نسلی تفاخر، زیردستوں پر مظالم، سرمایہ پرستی، بربہنیت کے نشہ میں بدمست تھیں۔ اکثریت انہی کی تھی جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

سیاست میں ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مملکت یا نظامِ حکومت کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ زندگی قبائلی تھی جس میں پنچایت کی رُو سے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے ہو جاتے تھے۔ اور اگر کہیں جنگ چھڑ جاتی تھی تو سو سو سال تک صلح کرانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نسلی اشتراک کے سوا کسی معیارِ اجتماعیت سے واقف نہ تھے۔

جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، غنیمت (یعنی لوٹ) ان کا بنیادی ذریعۂ رزق تھا۔ طبقۂ بالا کے معدودے چند افراد، تجارت بھی کرتے تھے اور سودی کاروبار بھی۔ اور کعبہ کے متولی ہونے کی بناء پر قریش کا ذریعۂ معاش مذہبی پیشوائیت تھا۔ بس یہ تھی ان کی زندگی۔ یہ تھا وہ خام مال...... (RAW MATERIAL) جسے تعلیم و تربیت سے قرآنی قالبوں میں ڈھال کر، بتدریج احسنِ تقویم کی سطح پر لے جانا مقصود تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے چار طریقے ہو سکتے ہیں:۔

(۱) بطور خیرات لینا۔

(۲) قوت کے زور پر کسی سے کچھ چھین لینا۔ اس میں چوری اور ڈاکہ ہی نہیں آتا۔ ہر قسم کا سلب و نہب اور استحصال بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔

(۳) چھپر پھاڑ کر کچھ مل جانا، جیسے وراثت میں ڈھیروں مال مل جانا، یا زمینی ذخائر کا بیٹھے بٹھائے مل جانا، جیسے عرب میں تیل کے ذخائر مل گئے ہیں۔ اور

(۴) محنت سے کچھ پیدا کرنا۔

عربوں کے ہاں پہلے تین ذرائع رزق ہی متداول تھے۔ اور قرآن کا منتہیٰ ان تینوں کو بند کر کے صرف چوتھے دروازہ کو کھولنا تھا۔

مختصراً یہ تھے وہ فضائے جاہلیت کے پروردہ عرب جو اسلام کی درس گاہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور جنہیں وہ قوم بنانا مقصود تھا جو اس کے نظام ہائے حیات کے قائم کرنے کی اہل ہو ——— نہ صرف ملک عرب میں ان نظاموں کے قیام اور استحکام کی اہل، بلکہ ایسی اُمّۃً وّسطاً جو شُہداء علی النّاس ہو۔

آپ سوچئے کہ ایسی فضا میں پروان چڑھے ہوئے ان افراد کو اس معیار پر پہنچانا تعلیم و تربیت کا کس قدر تدریجی عمل چاہتا تھا۔ قرآن نے اس پروگرام کو اَلْعَقَبَۃ کہہ کر پکارا ہے۔ (۹۰/۱۲) العقبۃ کے معنی ہوتے ہیں "پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا"۔ پہاڑ کی گھاٹی پر دوڑ کر نہیں چڑھا جا سکتا۔ اس پر قدم قدم چڑھنا پڑتا ہے، اور ہر قدم پر جس قدر سانس پھولتی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو کبھی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھا ہو ——— کوہ پیماؤں کی طرح رسّے باندھ کر نہیں، بغیر سہاروں کے قدم قدم۔

یہ گھاٹی ہے کیا؟ فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) خود بھی ہر قسم کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا، اور نوعِ انسان کو بھی آزادی دلانا: (یعنی جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے)۔

(۱) خوراک کی قلت کے زمانے میں بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرنا۔ (۹۰/۱۴)

(۲) ہر اس فرد کا مونس و غمخوار بننا جو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ (۹۰/۱۵)

(۳) مٹی میں لتھڑے ہوئے جس مزدور کو اتنا نہ ملے جس سے اس کی زندگی کی حرکت قائم رہ سکے، اس کی رکی ہوئی گاڑی کے چلانے کا انتظام کرنا۔ (۹۰/۱۶)

اس گھاٹی پر چڑھنے کا مرحلہ بڑا صبر طلب ہوگا۔ اس کے لئے ایسی جماعت کی ضرورت ہوگی جس کا ہر فرد دوسرے افراد کو استقامت کی تلقین کرے، اور یہ سب ایک دوسرے کا بازو تھامے آگے قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ (۹۰/۱۷)

یہ تھی وہ گھاٹی جس پر چڑھنے کے لئے ان افراد کو تیار کرنا تھا۔

اِن تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ان افراد کی اس تیاری (تعلیم و تربیت اور نشوونما) کے دور میں، منتہائی قوانین میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا ہی مقصود نہیں تھا جو انہیں ممکن العمل بنا دیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ تبدیلیاں ایسی ہوں جو ان افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی کرتی جائیں تاکہ حسب قانون کے اگلے درجہ میں پہنچیں (درجۃ کے معنی ہی سیڑھی کا اگلا ڈنڈا ہوتے ہیں) تو ان کے اپنے اندر بھی مناسب حال تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ سورۃ بقرہ میں ان افرادِ مؤمنین کی جو دعائیں مذکور ہیں، ان میں یہ دعا بھی ہے: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ..... (۲/۲۸۶)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں ہمت نہ ہو"۔ اس ترجمہ سے خدا کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! جس قدر بوجھل ذمہ داری ہم پر ڈالی جائے، اس کے اٹھانے کے مطابق ہمیں قوت اور ہمت بھی حاصل ہو۔ جوں جوں ان کی اطاعت کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی تھیں، اس کے مطابق ان کی صلاحیتیں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

یہ ہے اس نظام کا عبوری دور۔ چونکہ آپ نے صرف معاشی نظام کا ذکر کیا ہے، اس لئے میں اس کی چند ایک ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہو کہ عبوری دور میں منتہائی قوانین میں جو مراعات ملحوظ رکھی گئی تھیں، ان سے ان افراد کی سیرت میں کس طرح وہ تبدیلیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں جن سے وہ اس نظام کو، اس کی انتہائی شکل میں قائم کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

(۱) خیرات

اس معاشرہ میں، پست و بالا۔ امیر و غریب کا طبقاتی تفاوت بڑا شدید تھا۔ ایسا شدید کہ زیردستوں کو انسانی سطح پر سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسے معاشرہ میں، غریبوں اور محتاجوں کی مدد کا ذریعہ خیرات تھا۔ خیرات میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں لینے والے کی عزتِ نفس کو سخت ٹھیس لگتی ہے، اور دینے والے میں تکبر و نخوت کے جذبات اُبھر آتے ہیں، اور وہ مفلسوں اور محتاجوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ قرآن کو بھی، اپنے عبوری دور میں، محتاجوں کی امداد کا طریق بہرحال یہی رکھنا تھا، لیکن اس نے اسے ایسی شرائط سے مشروط کر دیا جس سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہوں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ (ضمناً۔ اس نے مروجہ معنوں میں خیرات کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ صدقہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے بنیادی معنی اپنے وعدہ یا معاہدہ کو سچا کر دکھانا ہے۔ اس اصطلاحی تبدیلی سے ہی اس کے مفہوم میں فرق پیدا ہو گیا)۔ اس نے اس قسم کی مدد دینے والوں سے کہا کہ جن کی مدد کرو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دو: لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹): ہم اس کے بدلے میں تم سے کوئی صلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی

متمنّی نہیں"۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے قرآن نے ان میں کتنا بڑا تغیرِ نفس پیدا کر دیا۔ دوسری جگہ کہا کہ اگر تم نے اس کا ذرا سا احسان بھی جتایا، یا کوئی اور ایسی حرکت کی جس سے ان غریبوں کو قلبی اذیت پہنچے تو یاد رکھو! تمہارا کیا کرایا سب باطل ہو جائے گا۔ (۲۶۴-۲۶۲/۲) ان کے لئے تمہارا وعدہ دلآزاری ہونا تو ایک طرف، اگر تم نے یہ مدد لوگوں کو دکھانے (رِئَآءَ النَّاسِ) کی خاطر بھی کی، تو بھی یہ باطل ہو جائے گی۔

یہ تو ہوا مدد دینے والوں میں تغیرِ نفس۔ جہاں تک لینے والوں کا تعلق ہے، اُن سے کہا کہ اسے تم "خیرات" (گداگری کے ٹکڑے) نہ سمجھو۔ یہ تمہارا حق ہے جسے تم ان سے لے رہے ہو وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۴-۲۵/۷۰)۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ خیرات دینے والے کے دل میں، غریبوں اور محتاجوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے ایک ایسا اصول تلقین فرمایا ہے، جس سے یہ نفرت، محبت سے بدل جاتی ہے۔ محبت (LOVE) کا لفظ جس قدر کثیر الاستعمال ہے اتنا ہی مبہم المعانی ہے۔ کوئی متعین طور پر بتا نہیں سکتا کہ محبت کہتے کسے ہیں۔ عصرِ حاضر کے علم النفس نے (LOVE) کی ایسی وضاحت پیش کی ہے، جس سے اس کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، "LOVE" کے معنی ہیں "دوسرے کی خواہش یا تقاضا کو اپنے پر ترجیح دینا"۔ قرآنِ کریم نے غریبوں کی مدد کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) "یہ ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے"۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک (بظاہر) معاشی خصوصیت سے، قرآن کس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ "خیرات دینے والوں" کے جذباتِ حقارت کو محبت میں بدل دیتا ہے۔

(۲)۔ حسنِ سلوک

(ہمارے) معاشرہ میں بوڑھے ماں باپ بوجھ سمجھے جاتے تھے، اور اگر اولاد ان کی مدد کرتی بھی تھی تو اُن سے بڑی درشتی سے پیش آتی تھی جس سے ان کی امداد نانِ تلخ بن جاتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اپنے عبوری دور میں، ماں باپ (بلکہ دیگر اقرباء، ہمسائیگان، حتیٰ کہ ضرورت مند مسافروں تک) کی امداد کو احسان کہہ کر پکارا جس کے معنی کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کر دینا ہے۔ اور احسان کو فریضۂ خداوندی قرار دیا۔ یعنی اس کا کسی کے جذبات پر انحصار نہیں رکھا، بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے والا کسی کے سر پہ (ہمارے مروّجہ مفہوم کے مطابق) "احسان" نہیں دھرے گا۔

(۳) یتامٰے

یتیم کے معنی وہی بچہ نہیں جس کے ماں باپ (بالخصوص باپ) فوت ہو چکے ہوں۔

اس کے معنی وہ افراد ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ وہ معاشرہ جبعفر داری کا تھا، اس لئے معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے مال و دولت کو لوٹ کھسوٹ کر لیے جاتے تھے۔ قرآن نے صاحبِ قوّت و ہمّت افراد کو ان یتیموں کا محافظ اور پاسبان مقرر کیا، اور انہیں واجب التکریم قرار دیا (۸۹/۱۷)۔

(۴)۔ وراثت

قرآنِ کریم کا بنیادی اصول ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔ وہ (UN— EARNED INCOME) کو جائز ہی قرار نہیں دیتا خواہ اس کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو۔ اس کی ایک شکل وراثت بھی ہے۔ عربوں کے ہاں عورتوں اور بچوں کو وراثت میں حصّہ نہیں ملتا تھا۔ بعض ممالک میں باپ کا سارا ترکہ بڑا بیٹا لے جاتا تھا۔ قرآن نے یونہی بیٹھے بٹھائے اس طرح امیر کبیر بن جانے کو ناجائز قرار دے دیا۔ (۴/۱۹)۔ اور ترکہ کو ایسے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں بانٹ دیا جس سے کثیر دولت ایک جگہ مرتکز نہ ہونے پائے (۴/۱۱-۱۲)۔ اس عبوری دَور میں قرآن، اکتنازِ دولت کو روک تو نہیں سکتا تھا۔ اُس نے اِس میں یہ اصلاح کی کہ دولت کی گردش اس طریق سے کی جائے کہ وہ اُوپر کے طبقہ ہی میں گردان نہ رہے (۵۹/۷) اس طرح جب دولت کی گردش کا دائرہ وسیع ہو جائے گا تو اس کا اکتناز خود بخود رقیق ہو جائے گا۔ اس میں "بائیس خاندان" دولت کے مالک نہیں رہ جائیں گے۔

(۵)۔ مالِ غنیمت

اِن عربوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر مالِ غنیمت (لوٹ کا مال) ہوتا تھا۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ جو جس کے ہاتھ میں آجائے، وہ اُس کا ہو جائے۔ قرآن نے اس میں یہ تبدیلی کی کہ مالِ غنیمت پورے کا پورا، امیرِ ملّت کے پاس جمع ہوگا جو اسے حسبِ اقتضا تقسیم کرے گا۔ یہ تقسیم ضرورت کے مطابق ہوتی تھی (مثلاً) غیر شادی شدہ کا حصّہ ایک ہوتا تھا تو شادی شدہ کے دو حصّے۔ اور اگر ساتھ گھوڑا بھی ہو تو اس کا حصّہ الگ۔

(۶)۔ پراپرٹی

عصرِ حاضر کے علمائے نفسیات و معاشیات نے پراپرٹی کی دو قسمیں کی ہیں:-

(i) PRIVATE PROPERTY اور (ii) FUNCTIONAL PROPERTY

لفظ پرائیویٹ کا مادہ لاطینی لفظ (PRIVARE) ہے جس کے معنی ہیں۔ "دوسروں کو محروم کر دینا"۔ لہٰذا، پرائیویٹ پراپرٹی سے مراد ایسی پراپرٹی ہے جس سے صرف اس کا مالک نفع اندوز ہو سکے، دوسرے لوگ اس سے محروم رہیں۔ (FUNCTIONAL PROPERTY) کے معنی ہیں اشیائے مستعملہ جسے ہر شخص عند الضرورت استعمال کر سکے۔ قرآنِ کریم پرائیویٹ پراپرٹی کو "استعمالی پراپرٹی" میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی

تکمیل تو نظامِ ربوبیت کی انتہائی شکل میں ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس کی ابتداء عبوری دور میں ہی کر دیتا ہے۔ اس کی بیّن مثال ربوٰا (سودی قرضہ) کو قرضِ حسنہ میں تبدیل کر دینا ہے۔ دولتمند شخص کے پاس جو فالتو روپیہ ہوتا ہے، اُسے وہ اپنی پرائیویٹ پراپرٹی قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس کی تجوریوں میں پڑی رہتی تو پڑی رہے، کوئی دوسرا اُسے استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی حاجتمند اُسے استعمال کرنا چاہے تو وہ اس سے اس کے استعمال کی قیمت وصول کرتا ہے۔ اسے ربوٰا کہا جاتا ہے۔ عبوری دور میں قرآن اس سے کہتا ہے کہ یہ روپیہ تمہارا ہی سہی، لیکن سردست تمہارے استعمال میں نہیں آرہا۔ تمہارے اس بھائی کو اس کی ضرورت ہے، اسے دے دو تاکہ وہ اسے اپنے استعمال میں لے آئے۔ استعمال میں لانے کے بعد یہ تمہیں تمہارا پورا واپس لوٹا دے گا۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹)۔ تمہارا روپیہ تمہیں واپس مل جائے گا۔ نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی، نہ اس پر۔ وہ اسے قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے کس طرح پرائیویٹ پراپرٹی کو فنکشنل پراپرٹی میں تبدیل کر دیا؟ یہی کیفیت، مزارعت کی ہے جس میں زمین (عبوری دور میں) مالک کی رہتی ہے، لیکن کاشتکار اسے استعمال کے لئے لیتا ہے۔ اور استعمال (فصل حاصل کرنے) کے بعد اس کی زمین اُسے واپس لوٹا دیتا ہے۔ یہی صورت مضاربت کی بھی ہے۔ قرآن کریم کا یہ (PROCESS) سارے عبوری دور میں کارفرما رہتا ہے تاآنکہ نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہو جاتا ہے، جس میں "نہ کوئی بندہ رہتا ہے نہ کوئی بندہ نواز"۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی، سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ذرائع پیداوار یا فالتو دولت، پرائیویٹ پراپرٹی رہتے ہی نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم اپنے عبوری دور میں، اتنا ہی نہیں کرتا کہ معاشی قوانین کو بتدریج تکمیل تک لے جاتا ہے۔ وہ اس جماعت کی اس طرح تربیت بھی کئے جاتا ہے جس سے ان کے قلب و دماغ میں اس انداز کا تغیر واقع ہو جائے کہ وہ نظامِ ربوبیت کو اپنے دل کا تقاضا محسوس کریں۔ اس مقام پر پہنچ کر انہیں اس کی بھی ضرورت نہیں رہتی کہ انہیں کوئی حکم خارج سے دیا جائے، تو وہ اس کی تعمیل کریں۔ احکام کی تعمیل کا ایک شکل محکومیت ہوتی ہے جس میں کسی کے حکم کی تعمیل، طوعاً و کرہاً (مرتے بھرتے) کی جاتی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ احکام کی اطاعت تو بطیبِ خاطر ہی کریں لیکن کریں اُس وقت جب کوئی خارجی اتھارٹی اس کا حکم دے۔ اس اطاعت میں آپ اپنے دل میں کسی قسم کی کبیدگی محسوس نہیں کریں گے، کیونکہ انہیں آپ نے، اپنے اوپر خود عائد کردہ فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ احکام کی تعمیل کا آخری درجہ اتباع کا ہے۔ آپ نے گائے کے نوزائیدہ بچھڑے کو دیکھا ہوگا۔ وہ کس طرح اپنی ماں کے پیچھے پیچھے، از خود چلا جاتا ہے۔ اسے ایسا کرنے کے لئے نہ تو کوئی مجبور کرتا ہے اور نہ ہی کوئی خارج سے ایسا حکم دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کے تقاضے سے، اپنی ماں کے پیچھے پیچھے کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔ عربی میں اسے اتباع کہتے تھے۔ اسی قسم کے لوگ درحقیقت نظامِ خداوندی کو قائم کرنے والوں میں السابقون الاوّلون ہوتے ہیں۔

(۰)

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ اس نظام میں کتنی چیزیں ایک فرد کی ذاتی ملکیت میں رہ سکیں گی؟ .... قرآنِ کریم نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے، اور اس ایک لفظ کا جواب نہیں۔ اس نے پورے کے پورے نظامِ ربوبیت کو اس ایک لفظ کے اندر سمٹا کر رکھ دیا ہے ـــــ اور یہی قرآن کا اعجاز ہے۔ اگر اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے کہ الفاظ کے انتخاب میں اس کا کس قدر اعجاز ہے تو قرآنی مفاہیم اور مقاصد کو سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔

عرب اکثر سفر میں رہتے تھے۔ لیکن سفر ایسا جس میں نہ نشاناتِ راہ نہ شاہراہیں۔ نہ راستے میں بستیاں، نہ آبادیاں۔ نہ سرائے، نہ ہوٹل۔ اس لئے ہر مسافر کو لابدّ سامانِ راہ اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ (مثلاً) ایک لوٹا۔ ایک ڈول۔ رسّی۔ لاٹھی۔ پانی کا مشکیزہ۔ ستوؤں کا تھیلا وغیرہ۔ یہ زادِ راہ ضروری تھا جس کے بغیر سفر نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف، مسافر فالتو اشیاء ساتھ رکھتا ہی نہیں تھا۔ (مثلاً) وہ دو دو لوٹے یا چار ڈول اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ یہ زائد از ضرورت چیزیں اس کے لئے بارِ دوش بن جاتی تھیں۔ وہ راستہ بھر انہیں استعمال کرتا۔ کوئی اور ضرورت مند ہوتا تو اُسے استعمال کے لئے مستعار بھی دے دیتا اور منزل پر پہنچ کر الگ کر دیتا۔ ان اشیائے سفر کو عربوں کے ہاں "متاع" کہا جاتا تھا۔ اب آپ غور کیجئے کہ جب قرآن نے تمام سامانِ زندگی کو متاع کہا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ ـــــ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) "تمہارے لئے اس کرۂ ارض میں کچھ وقت کے لئے رُکنا ہے، اور اس کا سامانِ زیست تمہارے لئے متاع ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک لفظ کے اندر، قرآن کا پورے کا پورا معاشی نظام کس طرح سمٹ کر آگیا ہے۔ یہ اشیاء میسر نہ ہوں تو سفر ہو نہیں سکتا۔ زائد از ضرورت ہوں تو وبالِ دوش بن جاتی ہیں۔

یہ تھا وہ سفرِ حیات جس کے لئے جماعتِ مومنین کو تیار کیا جاتا تھا۔

اب آپ کا وہ سوال سامنے آتا ہے کہ جن اسلامی واجبات کی ادائیگی کے لئے روپیہ درکار ہوگا، اگر کسی کے پاس فاضلہ روپیہ ہی نہ ہوگا تو وہ ان واجبات کو کس طرح ادا کرے گا؟ اس کے لئے آپ نے جو دو تین مثالیں پیش کی ہیں، ان کا حل نہایت آسان ہے۔ مہر تو محض ایک تحفہ ہے جو کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم نے بیوی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہے تو اسے واپس نہ لو، تو اس سے مقصود عربوں کے ایک مذموم معمول کو روکنا تھا۔ وہ لوگ (جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں بھی عام طور پر ہوتا ہے) نکاح کے وقت ڈھیروں مہر دے دیتے تھے اور شادی کے بعد مختلف تراکیب سے اسے واپس لینے کی سوچتے۔ قرآن نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ نہیں کہ اُس نے ڈھیروں مال دینا فرض قرار دیا ہے۔ مہر تو یوں سمجھئے کہ

یک نگاہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر!

اس میں کاروبار کا کیا سوال!

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ نظامِ ربوبیت میں ضروریات پوری کرنے کی شکل جیل خانوں جیسی نہیں ہوگی کہ ڈول میں دال انڈیل دی اور جلی ہوئی چار روٹیاں تھما دیں۔ اس کا نقشہ تو جنتی زندگی کا ہوگا جس میں آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر انواع و اقسام کی نعماء حاصل ہوں گی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ سب کو حاصل ہوں گی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ کسی ایک طبقے کو حاصل ہوں اور دوسرا طبقہ ان سے محروم رہے۔ ان نعماء میں سے کوئی اچھا سا تحفہ دے دینا کونسا مشکل ہوگا؟

دوسری شکل آپ نے دیت کی ادائیگی کی بتائی ہے۔ سو اس کا حل تو قرآن نے اس آیت میں بتا دیا ہے جس میں دیت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں کہا ہے کہ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (۴/۹۲)۔ "جس کے پاس اس کی ادائیگی کے لئے روپیہ نہ ہو، وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔" اصل یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے لئے اسلامی نظام، حالات کے مطابق، متبادل قوانین خود تجویز کیا جائیگا۔

حج ۹ھ میں فرض ہوا تھا۔ اور ۱۰ھ کا حج حضورؐ کی سربراہی میں ادا ہوا تھا۔ اس سے پہلے حج کی حیثیت انفرادی تھی۔ مملکتی نظام کے تحت تو یہ فریضہ نبوت کے آخری ایک آدھ سال ہی میں سرانجام پایا ہوگا۔ اس وقت انفرادی تحائف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہوگی۔ ویسے جہاں تک تحائف (ہدی) کا تعلق ہے، وہ فرائض و واجبات میں داخل نہیں۔ وہ تو دوستوں کے لئے تحائف اور عطیات ہوتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جیسا کہ تاریخ اور روایات سے پتہ چلتا ہے، نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں رسول اللہؐ کے عہدِ ہمایوں میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل بعد میں خلفاء کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ جنگِ تبوک جو ۹ھ میں ہوئی اور جو حضورؐ کے زمانے کی آخری جنگ تھی، اس میں عسرت کا یہ عالم تھا کہ (قرآن کے الفاظ میں) مجاہدین کے پاس پوری سواریاں بھی نہیں تھیں۔ وہ حضورؐ کے پاس آتے تھے تو آپ بھی بچشمِ نم معذرت کرکے رہ جاتے تھے۔ ان حالات میں معاشرہ ضروریاتِ زندگی کی افراط کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور تک نازل ہوتا رہا۔ اس لئے اس میں مکمل نظام کی تو حدود کی نشاندہی کی گئی ہے، تفصیلی احکام بیشتر عبوری دور کے ہیں۔ اس نکتہ کے سامنے رکھنے سے بہت سے اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔ اتنی بات البتہ واضح ہے کہ اس دور میں پراپرٹی کو پرائیویٹ کی جگہ فنکشنل بنا دینے کی طرف اقدامات کئے گئے تھے۔ اس سے اکثر و بیشتر معاملات حل ہو جاتے تھے۔ خود انفاق کا لفظ بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ انفاق کے معنی کھلا رکھنا ہے۔ اور پرائیویٹ پراپرٹی کے جو معنی پہلے بیان کئے جا چکے ہیں، ان کی رُو سے، اس کے لئے انفاق کی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسا صرف فنکشنل پراپرٹی کی صورت میں ممکن ہے۔ یہ اصولی تبدیلی اُس دور میں، رفتہ رفتہ، زیرِ تکمیل ہو رہی تھی۔

(۰)

باقی رہا اسلامی مملکت میں غیر مسلم رعایا کی پوزیشن۔ سو، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، انہیں شریکِ حکم تو نہیں کیا جا سکے گا جس حکم کی بنیاد مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ پر ہو، اس میں وہ لوگ کیسے شریک کئے جا سکتے ہیں جو سرے سے مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کو اتھارٹی ماننے سے انکار کرتے ہوں۔ غیر مسلم تو ایک طرف، یہ نظام تو اُن مسلمان نام رکھنے والوں کے ہاتھوں بھی قائم نہیں ہو سکتا جو مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کو آخری اتھارٹی تسلیم نہ کرتے ہوں۔ غیر مسلموں کو اُن کے "مذہب" کی آزادی ہوگی، لیکن انہیں کسی ایسے مسلک کی اجازت نہیں ہوگی جو وجہِ تذلیلِ انسانیت، یا باعثِ سلبِ و نہب ہو۔ اسلامی نظام کے قیام کی وجہ جواز ہی دنیا سے استبداد و استحصال کا ختم کرنا ہے۔ بنابریں، خود اس کے اپنے حیطۂ اقتدار میں وہ لوگ کیسے رہ سکتے ہیں جو جور و استبداد کو جائز سمجھتے ہوں۔ ان امور میں ان لوگوں پر (ضروری تبدیلیوں کے ساتھ) اسلامی قوانین بحیثیت قوانینِ مملکت لاگو ہوں گے۔ انہیں ان تمام امور سے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے گا۔ (یہ اسلامی مملکت کے دستور میں شامل ہوں گے)۔ اگر یہ ان شرائط کے مطابق اسلامی مملکت میں رہنا چاہیں تو ہوا المراد ورنہ انہیں اجازت ہوگی کہ وہ کہیں اور چلے جائیں۔

———— (۰) ————

آپ نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ مسلمانوں کے جس ملک میں "مذہب" (یعنی مروجہ اسلام) جس قدر زیادہ شدت سے کارفرما ہوگا وہاں اسلامی نظام کا قیام اسی قدر مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ اس نظام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت موجبِ غور و فکر نہیں کہ دنیا میں سیکولر نظام کے تحت تو فلاحی ریاستیں (WELFARE STATES) نظر آتی ہیں، مسلمانوں کے کسی ملک میں ایسی ریاستیں نظر نہیں آتیں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات بہت دھندلے پڑ گئے ہیں۔ اگر یہاں بے نقاب سیکولرازم نافذ ہوتا تو حالات زیادہ مایوس کن نہ ہوتے لیکن جب سیکولرازم مذہب کا نقاب اوڑھ لے تو اس فریبِ نگاہ (ILLUSION) سے قوم کا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں مجھ سے اکثر احباب کہتے ہیں کہ پھر تم یہاں بیٹھے اپنی عمر، وقت اور توانائی مفت میں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایسے حالات میں دین کے داعی کے لئے "ہجرت" ہی ایک راستہ رہ جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کرۂ ارض نے جو شکل اب اختیار کر رکھی ہے اس میں اس قسم کی "ہجرت" کا کبھی امکان نہیں رہا.... آپ "مذہب" کی تبلیغ کے لئے باہر نکلیں تو دنیا بھر کی مملکتیں آپ کو نہ صرف اجازت دیں گی بلکہ ہر قسم کی سہولتیں بھی بہم پہنچائیں گی، لیکن اسلام (الدین) کی تبلیغ کی اجازت، تو دنیا کا کوئی ملک بھی نہیں دے گا ——— نہ مسلمان ملک نہ غیر مسلم، خواہ وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو اور خواہ روس یا چین کی سوشلزم ——— اور اگر (بفرضِ محال) اس کی کہیں اجازت بھی ہو تو اسے ایک تحریک کے طور پر چلانے کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوگی میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان ممالک میں کہیں بھی میسر آ سکیں۔ اندریں حالات اب تو بہ سبیلِ تنزل اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس نظام کے متعلق جو کچھ میں لکھ چلا ہوں (اور وہ کچھ کم نہیں)

اسے (میری زندگی میں یا میرے بعد) ان ممالک میں پھیلا دیا جائے تو اس سے اچھے نتائج مرتب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں اسی مقصد کے پیش نظر ابھی تک قلم دوات کو ساتھ رکھے چلا جا رہا ہوں۔

لگا چلا ڈھیر راکھ کا میں، بجھا چلا اپنے دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اسے کارواں رہیگی

اور اصل تو یہ ہے کہ میں چاہوں بھی تو قلم دوات کو چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ..... "جن لوگوں نے اپنے دین کو مذاق سمجھ رکھا ہے اور دنیا کے ہنگامی مفادات نے انہیں فریب دے رکھا ہے ان سے کنارہ کش ہو جاؤ ..... بات یہیں ختم ہو جاتی تو خیر اسے چاہئے تھا۔ لیکن وہ اس طرح چھوڑ تا تھوڑا ہے! وہ آگے بڑھ کر گلے سے پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے: وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ...... (6/70)" لیکن اس کے باوجود قرآن کے ذریعے انہیں تباہی سے محفوظ رہنے کی تلقین کئے جاؤ تا کہ کوئی شخص اس لئے ہلاک نہ ہو جائے کہ اس تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ غلط کام کرتا رہا..... یہ ہے اس کا تقاضا! دنیا کو کیا معلوم کہ ہمارا معاملہ کس سے پڑا ہوا ہے۔

فغان من دل خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با چہ سلال افتادہ　　(غالبؔ)

اور خدا لگتی پوچھو تو اسے چھوڑ کر جینے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ پھر عمر تو رہنے کو رہتی ہے، زندگی باقی نہیں رہتی ـــ (کیا آپ نے عمر اور زندگی کے فرق کو اس سے پہلے سمجھا تھا؟ نہیں سمجھا تو اب سمجھ لیجئے کہ

جی لیا جاوداں جوانی میں　　زندگی عمر بھر نہیں ہوتی!

قرآن زندگی کے بغیر جینے والوں کو زندہ نہیں کہتا، مُردہ کہتا ہے۔ قرآن چھوڑا تو زندگی گئی! پھر سانس لینے والی لاش بن کر جینے سے کیا حاصل!!)

ــــــــــ (۰) ــــــــــ

میں نے اوپر مذہب کے لئے (ILLUSION) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ ہمارے ہاں تو اصطلاحات کو (DEFINE) کرنے کا معمول ہی نہیں۔ یہ اس لئے کہ ایسا کرنے سے فریب دہی یا فریب خوردگی کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن مغربی مفکرین بات ہی یہیں سے شروع کرتے ہیں۔ پروفیسر ، WHITEHEAD سے تو آپ متعارف

ؔ غالب تو کہتا تھا کہ کھلے بندوں کہہ دو کہ

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

لیکن میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ اس قسم کا لائسنس شاعر کو تو حاصل ہوتا ہے اور کسی کو نہیں۔

ہیں۔ دورِ حاضر کا عظیم ترین اور اس کے ساتھ ہی مشکل ترین فلاسفر۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کسی مسئلہ کو (DEFINE) کر دیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جائے گا۔ اس نے حق (TRUTH) کی ... تعریف متعین کی ہے۔ اسے دیکھئے اور جھوم جھوم جائیے — لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بلند حقائق چونکہ تجریدی (ABSTRACT) ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھانے یا عمل میں لانے کے لئے لامحالہ محسوس مظاہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

TRUTH IS THE CONFORMATION OF APPEARANCE TO REALITY

(ADVENTURES OF IDEAS. P. 309)

جب مظاہر حقیقت سے یکسر ہم آہنگ ہوں تو اسے ٹروتھ (حق) کہتے ہیں۔ اور جب مظاہر حقیقت کا عکس تو نہ ہوں لیکن ایسا بن کر دکھائی دیں تو اسے (ILLUSION) کہتے ہیں جیسے منافق کی مسکراہٹ۔ اس لئے (TRUTH) کا متضاد (ANTINOMY) جھوٹ (FALSEHOOD) نہیں بلکہ (ILLUSION) ہے۔ ..... ہمارے ہاں (ILLUSION) کے لئے کوئی موزوں لفظ نہیں۔

یہ معلوم کر کے آپ متعجب ہوں گے کہ عربی زبان میں باطل کے بھی یہی معنی ہیں۔

ٹروتھ (حق) کی اس تعریف سے دین اور مذہب کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جب مظاہر حقیقت کی صحیح تصویر یا ترجمان ہوں تو اسے دین کہا جائے گا، جب وہ حقیقت کے مظہر تو نہ ہوں لیکن حقیقت بن کر دکھائی دیں تو اسے مذہب کہا جائے گا۔ دین (TRUTH) ہے۔ مذہب (ILLUSION) ہے۔ قرآنی حقائق کی طرف دعوت دینے والوں کا کام مذہب کی فریب خوردہ قوم کو (DIS-ILLUSION) کرنا ہوتا ہے۔

———— (۰) ————

اور آخر میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کہ قرآن کے نزدیک مقصود بالذّات اعلیٰ و ارفع قوانین عطا کرنا نہیں، مقصود بالذّات ان کے ذریعے "انسان کو کچھ اور بنا دینا" ہے۔ میں نے محض سمجھانے کے لئے اسے "انسان کو کچھ اور بنا دینے" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے لئے کوئی متعین لفظ ہمارے ہاں موجود نہیں (وضاحت آگے چل کر آئے گی) پہلے اس اجمال کی تفصیل سمجھ لیجئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی قومیں اسلحہ سازی کی دوڑ میں پاگل ہو رہی تھیں۔ اس زمانہ میں اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے ایک دفعہ کہا کہ آجکل کی ساری سیاست کا نچوڑ یہ ہے کہ

(ONE WHO HAS STEEL HAS EVERYTHING)

جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے

علامہ اقبالؒ نے یہ سن کر کہا کہ میں اس میں ذرا سی تبدیلی کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

(ONE WHO IS STEEL IS EVERYTHING)

جو خود فولاد ہے وہ سب کچھ ہے

علامہؒ نے ذرا سی تبدیلی سے زندگی کا سارا راز منکشف کر دیا۔ ان کا سارا فلسفہ اسی نکتہ کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اس قدر طویل طویل تشریحات کے باوجود وہ کسی ایک لفظ میں یہ نہیں بتا سکے کہ اس (NE/IS) کا مفہوم کیا ہے۔ یعنی انسان کا کیا بننا زندگی کا مقصود ہے۔ ان کے ہاں خودی۔ خودشناسی۔ خودگری۔ خودسازی وغیرہ اصطلاحات بکثرت ملتی ہیں لیکن یہ سب بسیط (ABSTRACT) اصطلاحات ہیں۔ ان سے یہ بات نکھر کر سامنے نہیں آتی کہ انسان کا کیا بننا مقصود حیات ہے۔ وہ قرآن کے مقصد کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے قرآن تجھے وہ کچھ بنا دیتا ہے۔" لیکن یہ وہ بھی نہ بتا سکے کہ "خدا تجھے کیا بنانا چاہتا ہے۔" اس کے لئے وہ مومن کی اصطلاح ہی سامنے لائے لیکن اس اصطلاح کی حقیقت اس کے (ILLUSIONARY) مفہوم میں پوری طرح چھپ چکی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس اس کا بہترین ماڈل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ غلو پسند اور توہم پرست عقیدتمندوں کی شمعوں کے دھوئیں نے کائنات کے اس حسین ترین مرقع کو بھی کجلا کر رکھ دیا ہے۔؎

مغربی مفکرین میں سے پہلے برگساں نے اسے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ لیکن وہ بھی (BECOMING) اور (BEING) کے چکر میں کھو کر رہ گیا۔ ہمارے زمانے میں مشہور عالم نفسیات (ERICH FROMM) نے اسے اپنی کاوش کا موضوع بنایا۔ لیکن وہ بھی اس باب میں ناکام رہ گیا۔ اس نے کہا ہے کہ "انسان کا کیا بننا مقصود ہے" اس کے لئے ایک لفظ بطور اسم میں بھی تلاش نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں نے صرف اس کے فعل (VERB) تک اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ اس نے اس سوال کے جواب میں کہ مقصد حیات کیا ہے اپنی (آخری سے پہلی تصنیف) کا ٹائیٹل یہ رکھا ہے:۔

TO HAVE

OR

TO BE

یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا نچوڑ ہے کہ مقصد حیات کیا ہے؟ (TO HAVE OR TO BE)
اس کے صحیفہ "نظام ربوبیت" کا بھی یہی ٹائیٹل سمجھو۔

میں بھی ایک عرصہ سے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کریم کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس موضوع پر اچھا خاصا مواد بھی حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی موزوں لفظ مجھے ابھی تک نہیں مل سکا۔

؎ روم کے ایک گرجا میں حضرت مریمؑ کی ایک بے نظیر تصویر ہے۔ اس کے نیچے عقیدت مند اپنی ارادت کی شمعیں جلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان شمعوں کے دھوئیں نے اس تصویر کو چیکٹ بنا دیا ہے۔ غلو پرستوں کی شمعیں ہر بڑی شخصیت کے ساتھ یہی کچھ کرتی ہیں۔

(ERICH FROMM) کا ٹائیٹل موزوں ہے لیکن (TO BE) کا ترجمہ کیا کیا جائے؟ یہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے۔ زبان کی کوتاہ دامنی نہیں، درحقیقت یہ ایک تخلیقی مفکر کی دشواری ہے۔ وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے، اس کے ماحول میں وہ نیا تصور ہوتا ہے۔ (وہ نیا نہ ہو تو اسے تخلیق کہا ہی کس طرح جائے) چونکہ اس ماحول میں وہ تصور نیا ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے پہلے سے کوئی لفظ موجود نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اسے یا تو کوئی نیا لفظ مسکوک (GOIN) کرنا پڑتا ہے یا مروجہ الفاظ کو نئے معنی پہنانے پڑتے ہیں۔ پہلی صورت میں وہ اپنے ہم عصروں کے لئے معمہ بن جاتا، اور اس لئے اسے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہنا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں، اس کے حقیقی مفاہیم (ILLUSION) بن جاتے ہیں۔ اور اس کا زمانہ یا تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، یا اسے پاگل قرار دیتا ہے۔ یہ سب عملِ تخلیق کے (LABOURPAINS) ہوتے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ (لم یلد ولم یولد) تو تخلیقِ خداوندی کے لئے ہی مختص ہے۔

بہرحال بات کچھ اور واضح اور الفاظ کچھ اور روشن ہو جائیں تو اس موضوع پر قلم اٹھاؤں۔ ایرک فرام کہتا ہے کہ مقصدِ حیات (TO HAVE) ہے یا (TO BE)؟ لیکن قرآن ہمیں ایرک فرام سے آگے لے جاتا ہے۔ یہ مفکر (TO BE) OR (TO HAVE) کہتا ہے یعنی یہ یا وہ (دونوں نہیں) اس نظریہ کی رو سے اگر مقصدِ حیات (TO HAVE) قرار دے لیا جائے تو اس سے انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ اگر مقصد (TO HAVE) کو چھوڑ کر (TO BE) قرار دیا جائے تو یہ بدھ ازم یا عیسائیت کی رہبانیت ہو جائے گی۔ قرآن کی رو سے یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ اس کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ (TO HAVE) بھی ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں بلکہ (TO BE) کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ اس کے نظریہ کی رو سے (TO HAVE) کی حیثیت "متاع" کی ہونی چاہیئے کہ لوٹا ڈول نہ ہو تو سفر ہی نہ ہو سکے۔ اور اگر لوٹا ڈول لے کر گھر ہی میں بیٹھا رہے تو منزلِ مقصود تک پہنچ نہ سکے۔

———— (۰) ————

اور آخر میں معذرت، ان الفاظ کے ساتھ کہ —— لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم —— ویسے یہ ہماری قدیم روایت بھی چلی آ رہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس سوال کا اتنا جواب کافی تھا کہ یہ میرا عصا ہے۔ لیکن حکایت لذیذ تھی۔ وہ آگے بڑھے۔ کہا۔ یہ میرا عصا ہے۔ میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اپنی بھیڑوں کے لئے اس سے پتے جھاڑتا ہوں۔ ان کے علاوہ اس سے اور بھی بیسیوں کام لیتا ہوں۔ (۲۰/۱۸) وہ تو یوں کہیئے، اللہ میاں نے روک دیا ورنہ معلوم وہ اس داستان کو کس قدر طول دے دیتے؟

لیکن دیکھئے! خدا نے انہیں اس درازیٔ حکایت پر کچھ نہیں کہا۔ اس لئے میں بھی آپ سے ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔

والسلام

———— (۰) ————